باب ۱۲

انبساط

سُبْحَانَ مَنْ جَعَلَ خَزَائِنَهٗ بَیْنَ الْکَافِ وَالنُّوْن

''پاک ہے وہ ذات جس نے کاف ونون ان کے درمیان خزانے نکالے''

روح کا اِنبساط

انفرادی اعتبار سے دیکھیں یا اجتماعی اعتبار سے بھی افراد کی خاطر دیکھیں تو ہر کوئی خوشی چاہتا ہے۔ ہماری تگ و دو سب خوشی کے لئے ہیں۔ مگر بذاتِ خود خوشی کوئی چیز ہے کیا۔ خوشی کسی چیز کے نتیجہ میں حاصل ہوتی ہے گویا یہ صفت ہے کسی ذات کی۔ روح کی خوشی کا اندازہ اسی سے ہوسکتا ہے کہ محمد علی کلے فورمین سے جیت گیا تو شکرانہ کے آنسو نکل آئے، روح کا انبساط یہی شکریہ کے آنسو ہیں۔ یہ وہی غمِ اُمت کی جھلک ہے جو معراج میں بھی اُمتی اُمتی کی شکل لیتی ہے اور فتح بدر کے بعد سجدۂ شکر کراتی ہے۔ اور راتوں کو اُمت کے لئے مصلّی تر کرا دیتی ہے۔

یہ انبساط، یہ غم وہی تحفہ ہے جو خالقِ کائنات نے پیکر جمیل بنا کر اسی کے اندر سے نکال کر اس کو ہی پیش کر دیا تھا۔ یہ تحفہ سینہ بہ سینہ نسلاً بعد نسلاً انسان کی میراثِ امانت بنا چلا آرہا ہے۔ یہی وہ چراغ ہے جس کی روشنی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، عالم کو منور کرتے ہوئے اس امانت کو واپس لوٹانا ہے۔ ہمیں چاہے اقتدار ملے، علم ملے، دولت ملے یا جو بھی انعام اکرام ملے یہی

سمجھنا ہے کہ یہ امانت ہے، توفیقِ الٰہی ہے۔ اسی میں شکر گذار رہنا ہے اسی شکر میں انبساط حاصل کرنا ہے۔ یہ امانت وہی بوجھ ہے جو کائنات میں کوئی اٹھانے کے لئے تیار نہ ہوا تھا۔ اور قرعۂ فال اس دیوانے انسان کے نام نکلا۔ یہ وہی امانت ہے جسے اٹھاتے وقت حضرت عمرؓ رو پڑے تھے۔ امانت کے معنی ایک تو پونجی ہے، کنزِ مخفی۔ دوسرے یہ کہ میں تمہیں امین سمجھتا ہوں۔ اصل چیز یہی امین چن لیا جانا ہے جیسے کہ خلیفہ کو چُن لیا جاتا ہے۔ اس امین بننے کا معیار یہی ہو سکتا ہے کہ شعور کے اعتبار تک کسی نے اپنے اخلاق کو ثابت کر دیا ہو۔ آزمائش میں کھرا کھوٹا پرکھا گیا ہو۔ دوسرا اعتبار، اندھا اعتبار کر لو، بغیر آزمائے ہوئے بھروسہ کر لیا۔ محبت میں چُن لیا۔ تو خود انسانی فطرت میں ہے کہ اگر اس پر کوئی ایسا اندھا اعتبار کرے تو اسے کبھی دھوکہ نہیں دے گا۔ خواہ ایسے انسان کا اپنا کریکٹر کتنا ہی ذلیل کیوں نہ ہو، اس اعتبار کرنے کی لاج رکھے گا۔ یہ شخص خود اپنی ذات کے ساتھ صادق اور امین بن جاتا ہے اور جب امانت جیسی کی تیسی لوٹاوے تو سچا انبساط اسے خود حاصل ہوتا ہے۔

ان معنوں میں انبساط اور امانت اپنے ہی اندر کی صفات ہیں، اپنی ہی ذات کی صفات ہیں۔ ذاتِ حق بسیط ہے۔ سب عالَم انسانی کا باطن وہی ذاتِ حق ہے۔ اس لئے یہ عالَم انسانی کی فطرت میں ہے۔ اس طرح حق خود انبساط ہے۔ اور ماسوائے حق خواہ کچھ بھی ہو، اس میں کبھی بھی انبساط نہیں ہو سکتا۔ قرآنِ کریم کا ارشاد ہے۔ ''اَلا بِذِکرِ اللہِ تَطمَئِنُّ القُلُوب'' سنتے ہو۔ اللہ کے ذکر میں اطمینان قلب ہے، انبساط ہے۔ حق انبساط ہے۔ کوئی چیز جو حق سے کم ہے وہ بالکل انبساط نہیں۔ جھوٹی عارضی خوشی اور سچی دائمی انبساط کا فرق ہر انسان خود اپنے اندر پرکھ سکتا ہے۔ ہمیں کبھی اس چیز سے سچی اور دائمی خوشی

حاصل نہیں ہوتی جس کی حد اپنے جسم اور نفس تک ہو۔ خواہ رات دن ہم ایسی جھوٹی خوشی حاصل کرنے کی تمنا میں صرف کر کے زندگیاں گذار دیں۔ لیکن سچی خوشی کسی دکھے دل کو سہارا دینے، کسی بھوکے کا پیٹ بھرانے، کسی ننگے کو کپڑا دینے میں حاصل ہوتی ہے، بشرطیکہ اس کے ساتھ عقبیٰ میں نیک بدلہ حاصل کرنا نہ لگا ہو۔ خدمت، محبت، ایثار، اخوت، قربانی سب کی سب خود بخود اور بلا معاوضہ کی تمنا کے ہوں تو ایک روحانی قلبی سکون کا باعث بنتے ہیں۔

جنت کی تمنا کیا، جنت تک کی جنت دیدارِ الٰہی ہے۔ انبساط کی کیفیت کو اگر جنت سے تعبیر کیا جائے تو مومن کے لئے دیدارِ الٰہی ہی انبساط کی حد ہے۔ حق ہی انبساط ہے بشرطیکہ حق کو ایسی حقیقت مانیں جو ذرّہ ذرّہ ہے۔ ذرّہ ذرّہ اپنے رب کی تسبیح میں ہے۔ یہ کُن کا کیف ہے۔ کلی کھلنے کے عمل میں جو لطافت ہے، وہ انبساط ہے۔ خواہ یہ دل کی کلی کھلی رہی ہو، یا روح کی، یہ محرک چیز ہے۔

انبساطِ عید دیدنِ روئے تو

مغربی مفکرین کے نکتہ نظر سے دیکھیں تو حق یا حقیقت کے تین راستے ہیں خوبی، سچائی، حُسن، ان میں سے کسی سے بھی، حقیقت آشکار ہو جاتی ہے۔

خواہ بد سے بدتر انسان ہو، لیکن یہ فطری بات ہے کہ اچھائی کو اچھائی مانتا ہے۔ ہر تہذیب میں یہ بات پائی جاتی ہے۔ کیونکہ یہ نوع انسانی کی بنیادی سی صفت ہے۔ اور چونکہ انسان "اَحْسَنُ التَّقْوِیْم" ہے، قدرت کا شاہکار ہے، حق کے نمونے پر ہے، اس لئے اس کی یہ باطنی صفت جسے خوبی یا اچھائی کہتے ہیں اسی حق کی صفت ہے۔ غیرِ حق کی باطنِ تخلیق میں گنجائش کہاں، جب خوبی

اور حق ہم پلّہ ہیں تو جنہیں ہم اخلاقی اقدار کہتے ہیں، ان کی بنیاد حق ہے۔ کسی انسان کی خوبی یا اچھائی کو پرکھنے کے لئے اس کے عمل کو دیکھنا ہوتا ہے۔ یہ عملِ صالح مومنین کی صفت بتائی گئی ہے۔ ایسوں کے لئے ہی حیاتِ طیبہ کی بشارت دی گئی ہے۔ اور اُحسن جزاء کا وعدہ فرمایا ہے یہ اُحسن اجزاء سوائے دیدارِ الٰہی کے انبساط کے اور کیا ہوسکتی ہے۔ اور دیدار صحیح ہونہیں سکتا، جب تک ''رَائیتُ رَبّی بِرَبّی'' نہ ہو۔ دیکھا اپنے رب کو اپنے رب سے، حاصل نہ ہو۔

عملِ صالح

عملِ صالح کے پرکھنے کا امکان سوائے کلامِ ربانی کے ذریعہ جو انسان کو علم عطا ہوا ہے اور کوئی دوسرا ذریعہ ہونہیں سکتا۔ خواہ دنیا کے مصلحین اور معاشرہ کو اخلاق کا سبق دینے والے اپنی اپنی تہذیبوں میں اس عمل صالح کی کوئی بھی تشریح کریں۔ بنیادِ تخلیق، باطنِ انسانی کی جھلک یا فہم صرف علم لدنّی یا وحی کے ذریعہ حاصل ہونا ممکن ہے۔ اس پیام وتعلیم ربانی کو بالآخر زمانہ مان لے گا۔ قرآن کریم عالمِ انسانی کے لئے ہی نازل کیا گیا ہے۔ اسلام کی تعلیمات عین فطرتِ انسانی کے مطابق ہیں۔ اس لئے فطرتِ انسانی بالآخر اس منزل تک پہنچے گی۔ اپنی خوبی اور اچھائی کو اپنے حُسنِ باطنی، اپنے اندر کے حق کو پہچانے گی۔ فطرت کے مطابق زندگیوں کو ڈھالنا سوائے اس کے کیا ہوگا کہ اپنے اندر کی خوبی، حُسن اور حق کو پالیا جائے۔ اور انبساطِ دائمی حاصل کر لیا جائے۔ انسان کا جو عمل خود بخود ہو، اس میں دوئی نہیں ہوتی۔ بناوٹ اور دھوکہ کا پہلو نہیں ہوتا۔ اپنے نفس کی آلائشوں کا شائبہ نہیں ہوتا۔ اسی لئے اس عمل کو اس کی فطری صلاحیتوں کے مطابق کہا جاسکتا ہے۔ فطرتِ انسانی معصوم ہے،

حقیقت ہے، حق ہے۔

اس خوبی اور اچھائی کی مثال میں یہ بات بھی آجاتی ہے، کہ چیونٹی پر بھی غلطی سے پاؤں پڑ جائے تو خود بخود اس کا اثر اپنی ذات پر پڑتا ہے۔ یا کسی حادثہ میں دوسرے کو تکلیف ہو رہی تو لمحہ بھر کے لئے سہی، مگر یہ احساس ہوتا ہے، کہ جیسے یہ حادثہ اپنے ہی ساتھ ہوا ہے۔ یہ مثالیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ باطنِ انسانی ایک وحدت میں ہے۔ اس کے علاوہ کسی دوسرے میں بھی خوبی اور اچھائی کی بات دیکھ کر اپنے کو بھی خوشی سی حاصل ہوتی ہے۔ یہ ثبوت ہے اس کا کہ خوشی بھی بے ساختگی کی بات ہے اور اپنی فطرت میں ہے۔ زندگی کی شان دیکھی جائے تو دوسروں کے لئے عمل اور خدمت کرنے میں ہے۔ دوسروں سے اپنا کام لینے میں نہیں ہے۔ دوسرں کو دینے میں ہے، لینے میں نہیں۔ دوسرے سے محبت کرنے میں ہے، اپنے سے دوسرے کو محبت ہو جانے میں نہیں ہے۔ ٹیگور نے بھی کہا تھا زندگی ایک عطیہ ہے۔ ہم زندگی دے کر اسے کماتے ہیں۔ اسلام نے جو خوبی اور اچھائی کا نظریہ پیش کیا اس کی چھوٹی سی مثال ان زخمی مجاہدوں کی داستان میں ہے جنہوں نے آخر وقت میں بھی اپنا پانی کا پیالہ دوسروں کو دینے کے لئے کہا۔ ایسے نازک وقت میں یہ خوبی کی مثال ان مجاہدوں کے باطنِ وجود کی عکاسی کرتی ہے، جہاں خوبی ہی خوبی تھی۔ اجتماعی خوبی کی مثال ۱۹۶۵ء کی جنگ ہندو پاک میں ابھی ابھی قوم نے دیکھی ہے۔ ساری کی ساری جمعیت آنِ واحد میں ایک ہی جذبہ میں ہو گئی۔ اسی جذبے نے ایثار کی بھی سینکڑوں مثالیں پیش کر دیں اور خدمت کی بھی۔

یہ جذبۂ عشق! یہ جذبۂ مِ اُمت کیا انسانی معاشری یا فلاحی نظام پیدا کر سکتا ہے۔ بس یوں کہہ لو کہ انسانی فطرت میں جو حق ہے، یہ اسی کی کارفرمائی

ہے۔ انسانی فطرت میں جو حُسن و خوبی ہے یہ اسی کے زیر اثر ہوتا ہے۔ یہ مرکزِ حق کے سطح کی بات ہے۔ ظاہر میں جو مرکزِ حق بنا بیٹھا ہو، جسے خلیفتہ اللہ کہ لیں، وہی باطن کے مرکزوں پر شمسِ حقیت کی تجلی پہنچا سکتا ہے۔ یہی احسانِ وجود ہے۔ بغیر وجود میں ہوئے انسانیت کے کام نہیں آیا جاسکتا۔ حق نے بھی اپنے اظہار کے لئے وجود پیدا کیا۔ اسی بات کا مظاہرِ حق پر اطلاق ہوتا ہے چراغ سے چراغ جلتا ہے یہ اور بات ہے کہ انفرادی یا اجتماعی، خوبی اور حُسن کے منبع کو تلاش کرنا مشکل ہے۔ کسی میں خود بخود فطری طور سے یہ خوبی اور حُسن بھرا ہوتا ہے۔ اور کوئی کسی کے اثر میں آکر خوبی اور حُسن کا اظہار کرنے لگتا ہے۔ عالمِ انسانیت کے لئے اجتماعی خوبی یا اچھائی کی وہ سب مثالیں دی جاسکتی ہیں، جہاں کسی فرد کی کوششوں کے نتیجے میں عالمِ انسانیت نے فائدے اٹھائے۔ جیسے طاعون کو دنیا سے ختم کر دیا گیا۔ بجلی کے فائدے ساری دنیا اٹھا رہی ہے۔ ہر نئی ایجاد سے عالمِ انسانیت کو افادہ ہو رہا ہے۔ ایسے ہی انسانیت کے محسنوں کے لئے اجرِ عظیم ہے اس عملِ صالح کی بنا پر پاک زندگیوں کا ان کے ساتھ وعدہ ہے۔ انسان کے نیک اعمال اگر ذاتی سطح اور ذاتی فلاح کی خاطر محدود رہے تو ظاہر ہے کہ اس کا اجر بھی محدود ہی ہے۔ لیکن انسان کی شان یہ ہے کہ اپنی محدود وسعتوں سے باہر پھیلے۔ اس کے حُسن و خوبی زیادہ سے زیادہ عالمِ انسانیت کے لئے انبساط و خوشی لانے کا ذریعہ بنیں۔ پھیلاؤ کے لئے ضروری ہے کہ اپنے محدود بندھنوں کو توڑے جیسے محبوب جدا ہو جائے تو غمِ محبوب میں گھل گھل کر مر جانے کی بجائے، اس غم کو غمِ انسانیت میں بدل لے۔ ٹوٹا ہوا دل ہی کسی انسان کی زندگی میں یہ پھیلاؤ لا سکتا ہے۔ محبوب کے لئے وہ اپنے باطن کی حُسن و خوبی کو دنیا والوں پر بکھیرنے لگتا ہے۔ شمع کی طرح

خود بل بل کر اپنے ماحول کو روشن کرتا ہے۔ عشق محبوب، عشق جہاں ہو کر پھیلتا ہے۔ عشق بھی سنت الٰہی میں شامل ''اَلعِشقُ جَذبَۃٌ مِنْ جَذَبَاتِ الْحَق'' انسان کی فطرت میں یہ شامل ہے۔ جسم کی سطح تک رہ جائے تو نفسیاتی خواہش میں الجھ کر راہ کھوٹی کرتا ہے۔ قلب کی سطح سے اٹھ کر روحانی آسمانوں میں بلند ہو، تو ارتقائے روحانی کے سارے منازل طے کرا کے غیب سے پار ذات تک رسائی کراتا ہے۔ عاشقوں کی کائنات یہی غم ہے۔ کیونکہ

دل گیا رونقِ حیات گئی　　غم گیا ساری کائنات گئی

عشق سنّتِ الٰہی

عشق ہی کو قیام ہے، دوام ہے۔ اس کی حدیں لا محدود، جیسے حق لامحدود، ایسے ہی عشق بھی لامحدود۔ نہ یہ زمان کا پابند نہ مکان کا نہ وقت کے دائرہ میں محدود، نہ جسم کی بندشوں میں قید۔ کسی چیز کے حق یا سچ ہونے کا یہی ثبوت ہو سکتا ہے کہ وقت گذرنے پر بھی قائم رہتی ہے۔ جو عشق دیرپا اور قائم ہے وہی سنتِ الٰہی یا حق کہلانے کا مستحق ہے۔ یہ سنت الٰہی ایک بے ساختگی، ایک دوام لئے ہوئی ہے۔ یہ اپنے اندر ہی کی بات ہے۔ قانونِ قدرت کی بات دوسری ہے۔ یہ اشیاء سے ایک خارجی بات ہے۔ ان قوانین قدرت کے مطابق تبدیلیاں یا چیزوں کا ظہور میں آنا ظاہری اور مادی سطح کی بات ہے۔ سنتِ الٰہی کی بات باطن سے تعلق رکھتی ہے۔ جیسے قانونِ قدرت کے مطابق آگ کا کام جلانا ہے۔ لیکن سنتِ الٰہی کی بات یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے لئے وہ آگ ٹھنڈک اور سلامتی بن جاتی ہے۔ اگر یہ آگ حضرت ابراہیم کے اندر کی بات ہوتی تو جلا کر ہی چھوڑتی۔ حضرت ابراہیم کے باطن میں وہی حق

کی سلامتی اور ٹھنڈک تھی۔ اس لئے آگ کیا اثر کرتی۔ یہ مقامِ توحید کی بات ہے جو اندر تھا وہی ظاہر کو بھی ہونا تھا۔ اسی توحیدی کیفیت میں جو جلالی قوتیں ظاہر کی ہوتی ہیں ان کو اپنے باطن کے جمال میں سلب کیا جاسکتا ہے۔ جیسے شیر بھی ایک کتے کی طرح دم ہلانے لگتا ہے۔ یہ سکونِ باطن، اپنی حُسن وخوبی کی بات ہے، جو باطن میں ہے۔ یہ بچہ والا معصومیت سا انداز ہے۔ نہ خوف ہوتا ہے، نہ گمان۔ بچہ کو اچھال پھینکیں بھی تب بھی کھل کھلا کر ہنستا رہتا ہے۔

یہ اعتماد، یہ توکل، یہ بچہ کی صفت اپنے اندر قائم رہ جانا بڑی چیز ہے۔ ہے تو یہ بات عین فطرتِ انسانی کے مطابق کہ اپنے رب پر بھروسہ کرے لیکن وہم، گمان، جہالت یا علم اور سبب، نتیجہ کے چکروں میں پڑ کر یہ فطری صلاحیت مضمحل ہو جاتی ہے۔ اور ساری زندگی تاریکیوں میں ٹھوکر کھاتے رہنے پر بھی اعتماد اور سہارا اور توکل اسی ظاہری علم اور اپنی کوششوں اور مجاہدوں، ریاضتوں پر رہتا ہے۔ تو صحیح انبساط حاصل کرنے کے لیے اپنے باطن کی خوبی، سچائی اور حُسن کو ہی مشعلِ راہ بنانا ہوتا ہے۔ مومن کے لیے دیدارِ رب کے علاوہ کوئی انبساط نہیں۔ اس لیے بابا فریدؒ نے کہا تھا

دو نیناں مت کھائیو پیا ملن کی آس

بات لے دے کر محبت پر آجاتی ہے۔ محبت سے چھوٹا راستہ اپنے کو کسی دوسری ذات میں ضم کر دینے کا ہے ہی نہیں۔ محبت جتنی پھیلے اتنی ہی گہرائی اور وسعت انبساط کو ملتی ہے۔ محبوب کی خاطر خدمت میں انسان اپنے کو محبوب کے تصور میں ضم کر لیتا ہے تو اسے سچی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ البتہ محبت کسی فرد سے متعین ہو جائے تو اس کی خوشی بھی اتنی ہی محدود ہوتی ہے جب یہ

محبت پھیل کر انسانیت کے لیے ہو جائے یا کسی خاص سنت الٰہی کو لیے ہوئے خدمت کے رنگ میں ہو تو انبساط کو بھی وسعت ملتی ہے۔ اگر خدمت یا محبت کے نصب العین کا تعلق مستقبل سے ہو، تو انبساط کو بھی مکانی لیتی ہی نہیں زمانی وسعت بھی مل جاتی ہے، جو کہ اس زندگی کے لیے ہی نہیں بلکہ ہمیشہ کے لیے جاری رہتی ہے۔ محبت یا خدمت چونکہ بے لوث ہوتی ہے اس لیے نفس کی بندشوں سے آزاد کر کے عالمِ انسانیت کے ساتھ فرد کو ایکائی میں لے آتی ہے ایسا انسان اپنے کو ایک علیحدہ فرد تصوّر کرنے کی بجائے عالمِ انسانیت کا ایک جزو سمجھتا ہے اور اس جزو کو کل کی وسعت ملی ہوئی ہے۔ اور عالمِ انسانیت کی راحت میں اسے راحت ملتی ہے۔ اس طرح انفرادیت کی فنا ہوتی رہتی ہے اور اجتماعیت میں بقا، یہ ایک سلسلہ جاریہ بن جاتی ہے۔اور اس طرح بے لوث خدمت کے ذریعہ خوبی یا اچھائی مل جانا ہر ایک کے لئے ہے۔نظر کے ذریعہ البتہ کسی کسی کے لئے ہے۔ اس بے لوث خدمت سے اپنے حجابات اٹھنے میں جو خوشی حاصل ہے وہ اپنے ہی باطن کے خزانے کھلنے کی بات ہے۔ یہ خوبی اپنے اندر ہی کی بات ہے۔

حُسنِ باطن، پرورش و ارتقاء

عالمِ وجود میں اس خوبی کے جامع اور متحرک معنی عملِ صالح کے ہیں۔ یہ غم انسانیت میں زندگیاں صرف کر دینے کی بات ہے۔ یہ غم کا راستہ خواص کے لئے ہے۔ یہ کلی کی طرح معصوم اس نور سے بے خبر ہوتا ہے جو اس کے چہرے پر دوسرے لوگ اس کی طمانیت یا مسکراہٹ کی صورت میں دیکھتے ہیں۔ ایسے شخص کا حُسنِ باطنی یا اس کی خوبی باطن اب ظاہر میں بھی آچکی ہوتی

ہے۔ اندر باہر ایک ہی توحید اور ایکائی میں یہ زندگی گذار رہا ہوتا ہے۔ اور چونکہ یہ اپنے سے پھیل کر عالمِ خلق میں پھیل رہا ہوتا ہے اس لئے اس کے لئے یہ شگفتگی یہ انبساط ایک سلسلہء جاریہ کے طور پر ''کُلَّ یَوْمٍ ھُوَ فِیْ شَان'' کا انداز لئے ہوتی ہے۔ یہ انبساط درجہ بدرجہ آگے ہی بڑھ رہا ہوتا ہے۔ اسی انبساط کی تشریح میں حوروں، نہروں، جنت کے طبقات اور دیدارِ الٰہی کا ذکر ہے۔ یہ مدارج سب کے سب اپنی مثال آپ ہیں۔ ان کے صحیح معنوں کی فہم اور ان کی لطافتوں سے روشناسی اسی کو حاصل ہوسکتی ہے، جو مجردات سے روشناس ہو چکا ہو۔ یہ قلندر ہی کا شیوہ ہے کہ حُسنِ حقیقت کو تجرد میں دیکھتا ہے۔ حُسن کو بغیر حسین کے وجود کے دیکھتا ہے۔ خوبی کو اس کے تجریدی انداز میں ذرّہ ذرّہ پتہ پتہ میں پاتا ہے۔ مخلوق کی کوئی چیز ایسی نہیں ہوتی جس میں وہ حُسن و خوبی نہ دیکھ پاتا ہو۔ اسی نے حیات کا مثبت انداز اپنایا ہوتا ہے۔ اسی نے ہر غیر اللہ کی لا کرکے الٰہ کا روپ ہوتا ہے، اپنا لیا ہوتا ہے۔ یہی سچے معنوں میں اس کا مصداق ہوتا ہے۔ کہ

آنرا کہ خوش اند بہر　　بہر حال خوش اند

یہ انبساط، یہ خوشی اس حُسنِ باطن کے کھل جانے کی بات جو دستِ قدرت نے اپنے شاہکار کو عطا کیا ہے۔ اور کچھ اس انداز میں کہ خود ہی حُسن بنا، اس محلِ وجود میں سجا بیٹھا ہے۔ مٹی کی آنکھیں تو حُسنِ ظاہری کو دیکھ سکتی ہیں۔ حُسنِ باطن کی تاب کون لا سکے، جو ہر نوعِ اکملیت کے انداز میں ہے۔

حُسن مآلِ حُسن ہے یعنی حُسن جہاں ہے کامل ہے

یہ حُسن کیا ہے۔ جو اثبات عطا کرے وہ حُسن ہے۔ زندگی کی مثبت

قدروں میں قیام عطا کرے وہ حُسن ہے۔ حُسن، خوبی، حق ایک ہی عکسِ رخسار کے آئینہ دار ہیں۔ حُسن جس نوعیت سے جلوہ نمائی کرے ایک ہی حُسنِ حقیقت کی جھلک ہے، خواہ اسے قلبِ سلیم کہہ لیں یا معصومیت، ماں کا بچہ پر جان فدا کرنا کہہ لیں یا بچہ کا ماں کو دیکھ کر کھل پڑنا۔ انسان کا بچہ ہو یا خلقِ جدید، سب ہی ''اَحْسَنُ الْخالقین'' کا کرشمہ ہے۔ ساری کی ساری کائنات حق کے حسین تخیل کا وجودی پیکر ہے۔ ہر پیکرِ حُسن اپنے ہی حُسن کی آئینہ داری کرتا ہے۔ خواہ اسے آہِ سحر گاہی کہہ لیں یا آنکھوں کی ٹھنڈک، دل کی جولانی کہہ لیں یا مظاہرِ قدرت پر حیرانگی، یا بے خودی کہہ لیں یا سحر کی کیفیت۔ تڑپتا ہوا دل کہہ لیں یا برقِ حُسن دل کی ویرانگی کہہ لیں یا معشوق کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھا شجاعت کا روپ ہو یا شہادت کی عظمت، سخاوت، امانت، دیانت ہو یا خلوص، محبت، خدمتِ خلق غرض ہر رخسارِ دوست میں اپنے ہی آپے کا دیدار ہے۔ اپنے ہی حُسنِ باطن کی جھلک ہے۔ حُسن اور اپنے اندر کی خوبی کی یکتائی ہے۔ ظاہر ہے اور باطن میں ایک ہی توحید ہے جو حق ہے۔ یہی ''کُلَّ یَوْمٍ ھُوَ فِیْ شَان'' کے حسین روپ ہیں۔ نورِ محمدیؐ کی کائنات کے ذرّہ ذرّہ میں تابانی ہے۔ سارے کے سارے حسین پیکر ''مَااَعْظَم شَانِی'' کی بولتی تصویر ہیں۔ صانعِ حقیقی کے جمالِ باکمال کے آئینہ دار ہیں۔ لہٰذا صاحُسنِ کامل وہی ہے جو اثبات میں قیام عطا کرے۔ مجردات سے ہم کنار کر کے، زندگی کی مثبت اقداروں میں انسان کو مستحکم کر سکے۔

یہ جو حُسن کے ذریعہ قلب کو سکون، وجود کو راحت، آنکھوں کی ٹھنڈک، روح کو انبساط، زندگی کو مثبت اقداروں میں قیام ملتا ہے، یہ خود اس بات کا ثبوت ہے کہ ہر جھوٹی چمک، جھوٹی کشش عارضی ہے۔ اس کا نتیجہ بے قراری،

بے چینی ، نامرادی اور فنا ہے۔ دائمی قرار ، سکون اور قیام حقیقی اقدار میں ہی ہے۔ وَجْهُ رَبِّی کو بقا ہے۔ ان ہی معنوں میں حق اور حُسن ایک ہی حقیقت کے آئینہ دار ہیں۔ لازم وملزوم ہیں جس طرح موسیقی یا سماع روح کی غذا ہے۔ اسی طرح حُسن، حق کی غذا ہے۔ یہ غذا آنکھوں سے کھائی بھی جاتی ہے اور پی بھی جاتی ہے۔ ''مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی'' نہ پلک جھپکی نہ نظر ہٹی، ٹکٹکی باندھ کر دیکھا۔ اس دیکھنے میں سرور و کیف کی دائمی راحت ملی یا برقِ تجلی کی ضربِ کاری۔ دونوں ہی قائم دائم ہو کر زندگی کی پائدار قدر بن گئے۔

یہی حُسن کی غذا، امرت ہے، انسان کو امر بنا دیتی ہے۔ روح کی نشو ونما اور ارتقاء کا ذریعہ بن کر بقائے دوام عطا کرتی ہے۔ اس کی مثال ایک درخت کی نشو ونما کی طرح ہے۔ بیج کو زمین میں پیوست کر دیتے ہیں، بیج عشق کی چنگاری ہے۔ یہ ''اَمرِ رَبِّی'' ۔ یہ زمین وجود ہے۔ اس زمین میں بیج کا کلّہ پھوٹنے اور اس پودے کی نشوونما کے لئے تین اور چیزوں کی ضرورت ہے۔ پانی، ہوا اور روشنی۔ یعنی ذکرِ جلی، ذکرِ خفی اور شمسِ حقیقت۔ نشو ونما صحیح ہونے کے لئے زمین زرخیز ہو، شور نہ ہو۔ یعنی وجود، نفسِ امّارہ کے فاسد مادے سے پاک ہو۔ اسی لئے سب سے پہلے زمینِ وجود کا ٹھیک اور درست کرنا ہے۔ نفسِ امارہ کی پُرکاریوں اور فریب کے شور سے زمینِ وجود کو بچانا ہے۔ اس سطح کا تقویٰ یہی ہے۔ زمین کی مٹی کی موزونیت نسبِ پاک پر منحصر ہے۔ نسبِ پاک ہو تو خوش قسمتی ہے۔ وگرنہ چلّوں اور اکلِ حلال سے خون صاف کرنا ہے۔ اکلِ حلال وہی ہے جو یار کی طرف سے عطا ہو۔ چلے وہی ہیں جس میں یار کو اپنے اندر سمویا جائے۔ شکمِ وجود اگر نفسِ امّارہ کے شیطانوں سے بھرا ہو تو فاقوں اور روزوں سے اس شکم کو پاک صاف کرنا ہے۔ ہوس، حسد، بغض، نفسانفسی،

امارت، اقتدار، جاہ جلی وغیرہ تمام برے افعال اور خیالات سے فاقہ اور روزہ ہے۔ جب اس طرح ہل چلا کر زمین صاف ہو جائے تب ہی کہیں اس قابل ہوتی ہے کہ پچھلی تمام فصلوں اور نسلوں کی کھاد ملا کر اس میں زراعت کی جا سکے۔ زمین نرم بھی نہ ہو، کیونکہ پودے کے وجود کو اسی مضبوطی سے تھامنا ہے۔ ان مجاہدوں کے بعد ہی کہیں اس زمین کی گودی میں بیج ڈالا جا سکتا ہے۔ اس طرح قلبِ وجود میں حق کا بیج بونے کے بعد، حق کی راہ پر لگانے کے بعد اسے پانی دینا ہوتا ہے۔ یہ ذکرِ جلی ہے۔ اس کے بعد ہوا کا فیضان جو مٹی کے ذرّوں میں بھی پنہاں ہے اور محیط بھی ہے یہ ہوا ذکرِ خفی ہے۔ پاس انفاس ہر سانس میں محبوب کی یاد۔ لیکن صرف زمین، پانی اور ہوا ہو اور روشنی نہ ہو تو تاریکی میں اسے فنگس یا کیڑا لگ کر اسے ختم کر ڈالتا ہے۔ بیج سڑ جاتا ہے اور بار آور درخت بننے کے لائق نہیں رہتا۔ یہ روشنی فیضانِ حق ہے۔ اس لئے مجاہدے، ذکر، اذکار، ریاضتیں خواہ کتنی ہی ہوں اگر فیضانِ حق، توجہ شیخ شامل نہ ہو تو نامرادی ہے۔

روشنی تک رسائی نسبتِ شیخ سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ روشنی نورِ محمدیؐ کی تجلی ہے۔ کہتے ہیں جب سات بار نورِ محمدیؐ کی تجلی کسی دانے پر پڑتی ہے تب کہیں کلّا پھوٹتا ہے۔ باطن وجودِ انسانی پر یہ فیضانِ کُن کرم ہی کی بات ہے۔ اس میں نہ اپنی کوششوں کو دخل ہے، نہ محنتوں اور ریاضتوں کو۔ کاملین کی نگاہِ توجہ سے، امر باللہ کے احسان سے ہی یہ کُن کی ساتوں منازل طے ہوتی ہیں، ساتوں آسمانِ وجود طے ہوتے ہیں۔ یہ نفس، قلب، روح، سر، خفی، اخفا، غیب کی منازل ہیں۔ جب چھلکے اتر کر کلّا پھوٹا لا الٰہ ہوا۔ ہر غیر اللہ کے پردے ہٹے تو اِلّا اللہ کا نمود ہوا۔ پھر تُو ہی تُو اللہ ہو۔ ساتوں آسمانوں میں پھیلے۔

''فَرُعُهَافِی السَّماء '' نصیب ہوا۔ اور ساتھ ہی جڑیں بھی زمین میں پیوست ہو کر پھیلیں۔ ''اَصْلُهَا ثَابِتٌ '' کے بھی مصداق ہوئے۔ یہ بقا کی منازل ہیں۔ اور روحانی ارتقاء کی بھی۔ شمسِ حقیقت کی تجلی ہی میں اب حُسنِ وجود کی بہار ہے۔

یہ تجلی تین سطحوں پر کام کرتی ہے۔ بالکل اسی طرح روشنی کی کرشمہ سازی تین جہتوں سے کام کرتی ہے۔ اول یہ کہ حیوانی سانس سے جو فاسد ہوا، کاربن ڈائی آکسائیڈ خارج ہوتی ہے۔ اس کو ہضم کر کے اس کے بدلے صالح ہوا، آکسیجن عطا کرتی ہے۔ یہ پاس انفاس کا ذکر ہے جو نسبتِ شیخ میں محبوب کی یاد ہے۔ عشق بہ امر باللہ کی واردات ہے۔ سانس اندر، سانس باہر روح الامین کو سینچتا ہے۔ شمسِ حقیقت کی روشنی میں ذکرِ خفی کو بھی پینا ہے اور اردگرد کے ماحول کو اس ذکرِ خفی سے تازگی اور حیات بخشنا ہے۔

دوسری جہت پر روشنی کی کارفرمائی یہ ہے کہ پودے کو زمین وجود کی سطح سے اٹھا کر شمس کی طرف اٹھاتی ہے۔ یہ ہیلیو ٹراپزم ہے۔ شیخ کی سمت کشش ہے۔ اردگرد، اندر باہر اس کی تجلی کارفرما ہے۔ اسی کی توحید میں پروان چڑھنا ہے۔ جب روشنی سمو کر سینہ سمندر ہوا، انا رُوحی پکار اٹھے۔ اب تیسری جہت پر اس روشنی کی کارفرمائی یوں ہوئی کہ اس روشنی کی حرارت سے کلیاں اور گل بنے۔ درخت میں پھل آئے۔ پھل پھول چیخ کر بیج بکھرے۔ نشرِ حق کا ذریعہ بنے۔ ذات کو اپنے اندر سموئے، اب اس لائق ہوئے کہ پھر سے دنیا کے کام آئیں۔ گلوں سے دنیا کو گلزار بنائیں۔ خلقت کو اس ریاضت اور قربِ ذات کے پھل کھلائیں۔ اور حق کے بیج پھر سے اس عالم میں بکھریں۔

ایسا درخت بھی حسین، کلی اور گل بھی حسین، پھل بھی حسین۔ سیراب ہونے والے بھی حسین۔ ایک زندگی نے سینکڑوں زندگیوں کو جنم دیا۔ اپنی فنا

کر کے ان میں بقا حاصل کر لی۔

''کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ وَّ یَبْقٰی وَجْہُ رَبِّکَ ذُوالْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ''

اس طرح دیکھا جائے تو خواہ کتنا ہی حسین ہو۔ جب اس کی روح پرواز کر جائے تو سب حُسن سلب ہو جاتے ہے۔ ایک بلب کی طرح جو فانوس میں ہو۔ جب بلب فیوز ہو جاتا ہے تو سب حُسن غائب۔ صرف ایک شیشہ کا ٹکڑا رہ جاتا ہے۔ اس شیشہ کی چمک دمک اسی روشنی کے حُسن سے تھی، اس وجود کا روپ تجلی حق ہی تھا۔ گو اس وجود تک کو حُسن حق سمجھ کر پوجا جا سکتا تھا۔ مگر وجود تو ایک مٹی کا بت ہی تھا۔ یہ عکسِ رخسارِ حق ہی تھا جس کی تجلی پیکرِ سفال پر آئی تھی۔ اسی حُسن سے جامِ سفال چھلک اٹھا تھا۔ رخسار دمک اٹھے تھے۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔ پیشانی چمک اٹھی تھی۔ آنکھوں میں محبتوں کے سمندر امنڈ آئے تھے۔ دیکھا جائے تو حُسنِ حق کا نکھار اس شیشہ وجود سے ہی اظہار میں آیا تھا۔ یہ حُسن وہی حُسن تو تھا جو روئے لیلیٰ پر تجلی حق بن کر چھایا تھا۔ اور جس نے مجنوں کے قلب پر برقِ حُسن گرائی تھی۔ اس حُسن کی تجلی میں حُسنِ قلبِ مجنوں نے حُسنِ رخِ لیلیٰ کی آئینہ داری کی تھی۔ حُسن، حُسن کے مقابل ہوا تھا۔ مجنوں نے لیلیٰ میں اپنے آپ کو دیکھا تھا۔ اپنے پر ہی فدا ہوا تھا۔ یہی تو تھا جو عشق کی معراج بنا۔ یہی حُسن کی محمل۔ ''مَازَاغَ الْبَصَرَ'' ٹکٹکی بندھ گئی۔ آنکھوں کو ٹھنڈک ملی۔ یہ سحرِ عشق تھا یا سحرِ حُسن، پل جھپکنے میں منازلِ عشق طے ہوئیں۔ حُسن کی جھلک خود روئے عاشق پر آ گئی۔ دونوں ہی محبوب بنے۔ حق، حق، حق۔

کسی نے ارتقاء کی دھیمی چال چلی۔ کسی نے چشم زدن میں منزل پار

کی۔ ایک حق میں جا ملا ضم ہوا۔ دوسرا بعدِ وصل دنیا کے کام آیا۔ حق کے اجراء کا ذریعہ بنا۔ ایک نے اپنے کو محمل تک پہنچایا اور وہیں کا ہو رہا۔ دوسرا ساری خلقت ساتھ لے کر منزل پر پہنچا۔ ایک خدائی سے سمٹ کر خدا میں جا ملا۔ دوسرے نے ساری خدائی سمیٹ کر خدا سے ملا دی۔

''وَتَبَارَکَ اللّٰہُ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ''

احسن خُلق ہی حُسن و خوبی کا پیکرِ محبوبیت کا مصداق ہو سکتا ہے۔ انسانیت کے لئے نمونہ بن کر پیش ہو سکتا ہے۔ حُسن، خوبی، حق وہ چھپے خزانے ہیں جو محبوب کو ظاہر، باطن میں عطا ہوئے ہیں۔ اور اس محبوبیت کے طفیل سب عالمِ انسانیت کو۔ اب اس عالمِ انسانیت کو حُسن و خوبی کے چھپے خزانے اپنے باطن میں ہی پانا ہیں۔ اس خزانے تک رسائی کی کنجی غم ہے۔ جو تحفۃً اس ''اَحْسَنُ التَّقْوِیْم'' کو عطا ہوا تھا اس غم کو غمِ عشق کہہ لو یا غمِ خلق۔ اس کو بروئے کار لانے کا ذریعہ اپنے باطن کا کھلنا ہے۔ ذکرِ خفی بہ اَمرِ رَبّی اس عشق کی فطری صلاحیت کو بیدار کرتا ہے۔ ارتقائے باطن کی منازل طے کراتے ہوئے اپنے غیب تک رسائی کرا دیتا ہے۔ فتح الغیب، غیب کا کھلنا بھی بہ امر ربّی ہے۔ شمسِ حقیقت کی روشنی میں اپنے حُسن و خوبی کو پہنچنا ہے۔ ذکرِ خفی، پاس انفاس، غمِ عشق کا عطیہ ہے۔ ظاہر میں حُسن و خوبی کی جھلک دیکھی ہو، اس کی اپنے ہی باطن کے حُسن و خوبی کی عکاسی ہے۔ یہ باطنی حُسن و خوبی ہی حقیقت ہے، افضل ہے، اکمل ہے۔ یہی حق ہے۔ اسی لئے فرمایا تھا

''مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ''

''جس نے اپنی ذات کو پہچانا اس نے رب کو پہچانا''

یہ احسان ہے شمسِ حقیقت کا کہ زمین وجود، پانی اور ہوا، ذکرِ جلی،

ذکرِ خفی کی مناسبت میں بیج کو پھلنے پھولنے کی سعادت بخشی۔ اپنی جانب اس پودے کو کشش دیکر ایسا نوازا کہ خود ہی اس پودے کا حُسن بن بیٹھا۔ ظاہر کو بھی اس طرح کیا کہ خلقت کے کام آئے اور باطن کو بھی وہ انبساط بخشا کہ ہر کلی، ہر شگوفہ فرطِ انبساط میں جھوم اٹھا۔ بچہ کی سی معصومیت لئے فطرت کا وہ شاہکار بنا، جس کے لئے ''اَحْسَنُ التَّقْوِیْم'' کے لقب سے یومِ ازل نوازا گیا تھا۔ پھر جب اس رشکِ کائنات کی نظر اپنے حُسن وخوبیِ باطن پر پڑی تو اپنے آپ پر فدا ہو گیا۔ اپنی معراج آپ ہوا۔ پھر بھی شانِ عبدیت کو نہ چھوڑا۔ شمسِ حقیقت کے احسان کا بدلہ یوں دیا کہ سربسجود ہو کر دائمی فرطِ انبساط میں اس کے وجود سے صوتِ سرمدی بلند ہوئی۔

یہ خوبی ہم چومہ تابندہ باشی
بہ ملکِ دل بری پایندہ باشی

انبساطِ عبودیت

یہ انبساطِ عبودیت ایک سچی دائمی خوشی کی محرک اور زندہ کیفیت ہے۔ دائمی امن و سلامتی کی لازوال، پرسکون، ہمہ گیر دولت ہے۔ یہ وہ کیفیت ہے جو ایک کھلتی ہوئی کلی کی مثال کی طرح ہے۔ جو بے ساختگی میں ایک متبسم بچہ کو نصیب ہے۔ یہ مستی خود آگہی میں ایک قلندر کی شان ہے۔ اخلاص و وفا میں ایک صادق کی زیبائش ہے۔ خدمت، ایثار اور قربانی کے جذبہ میں ایک پیکرِ خوبی و اچھائی کو حاصل ہے۔ ''حُسنِ لَم یَزَل'' کے آئینہ میں جمالِ دوست کے دیکھنے والے کا نور ہے۔ گیسوئے مشکیں نافہ ذات کی خوشبو میں مست ہو کر ایک پیکرِ حُسن و جمال کی آئینہ داری ہے۔ یہ انبساط ایک عبدِ کامل کے شوقِ عبدیت

کا صلہ ہے۔ اسی انبساط کو شانِ عبدیت کہہ لیں، کَیفِ کُن کہہ لیں، نورِ محمدیؐ کی تابانی کہہ لیں۔ سچائی، خوبی، حُسن کہہ لیں۔ اُس کی ہر تجلّی سبحان اللہ، اس کے ہر پیکر پر سلام، ''سَلَامٌ عَلٰی اِبْرَاهِیْم، سَلَامٌ عَلَی الْیَاسِیْنَ ، سَلَامٌ عَلَی الْمُرْسَلِیْن'' اور فقراء کے لئے ''سَلَامٌ هِیَ حَتّٰی مَطْلَعِ الْفَجْر'' فقر میں جہاں لیلۃ القدر، جذب کی حالت ہے وہاں مستِ خودی ہو جانا مطلع الفجر ہے۔ اس مطلعِ فجر کا انبساط ہی نورِ ظہور ہے۔ ''فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَف'' کی تنویر ہے۔ اپنے شاہکار پر خود فدا ہو جانے کی بات ہے۔ اسی اندازِ خودستائی میں پندرھویں پارے میں جہاں انبیاء کا ذکر ہے تو ارشاد ہے۔ ''ان کی پیدائش پر سلام، ان کی زندگیوں پر سلام، ان کی رحلت پر سلام''۔ اور حضرت عیسیٰؑ کے ذکر میں ہے کہ خود ان پر سلام۔ پھر جب اپنے محبوبؐ کا ذکر آتا ہے تو فرماتے ہیں ''وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَک'' اور سلام ہی نہیں بلکہ درود و سلام بھیجا جاتا ہے معہ ملائک کے۔ اس فرطِ انبساط کی گونج ارض اور سمٰوات سے بلند ہوتی ہے۔ وہ فرطِ انبساط میں درود اور سلام بھیجتے ہیں، محبوبؐ پر اور اسی فرطِ انبساط میں کائنات عالم سے سبحان اللہ کی صدا بلند ہوتی ہے۔ ارض و سمٰوات کی ہر شے تسبیح کرتی ہے۔

بین الکاف و النون

''سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ مَنْ جَعَلَ خَزَائِنَه، بَیْنَ الْکَافِ وَالنُّوْن''

''پاک ہے وہ ذات جس نے کاف اور نون کے درمیان خزانے ڈالے''

دائمی انبساط، شکر، دائمی حُسن و خوبی سچائی۔ اس کے لئے ک اور ن ہے جس نے جاری کر دیئے ہیں۔ عِلمِ لُدُنی کے خزانے کاف اور نون کے

درمیان۔ یہ تسبیح و ذکر اس کے لئے ہے جس کے حُسنِ ازلی کی تائید ہر باطنِ وجود، مابین ک و ن کی ازلی رعنائیوں میں جاری رہتی ہے۔ یہ ذکر وہ ہے جس میں ایک معصومیت ہے۔ اور فکر میں حُسن و رعنائی کی دلکشی ہے۔

ذکر میں ہے تڑپ کلی کی سی
فکر میں کِھل گئے گلاب ہوئے

ک اور ن کے مابین بھی یہی کلی کی تڑپ ہے۔ غنچہ کی سی چٹک، بوئے ذات کی مہک، نمود کی معصومیت، فروغ کی شدت، برق کی لپک، عشق کی مستی، حُسن کا سوزِ دروں، حُبِ ذات کا خمار۔ انائے ذات، خود آگہی، شدتوں کے برزخ کی حالت۔ یہ تڑپ، انائے مطلق اور اس کے ظِل انائے وجود کے مابین برزخ ہے۔ ک اور ن کے درمیان یہ تڑپ تمام شدتوں سے شدید تر ہے۔ تمام کششوں سے لطیف تر ہے۔ مادے کے درمیان کشش ثقل، برق پاروں کے مابین کششِ برق، دل نگاروں کے درمیان سوزِ روحانی عارفانِ ذات کے مابین احدیتِ کبریائی۔ یہ تڑپ، حُسنِ مجرد کے نمود کی محرک قوتِ کُن ہے۔ جلوہ نمائی ذات کا اضطرار ہے۔ خزائن مخفی نورِ محمدیؐ کی نقاب کشائی ہے۔ ذات اور انا کے مابین، شوقِ نمود ہے۔ انائے مطلق کی شان ھاھُو ہوتی ہے۔ اس شدت میں اپنا عرفان کرنا چاہا۔ ''فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَف'' فکر میں کھل گئے۔ حُسن، خوبی، حق نے جلوہ نمائی کی۔ سبحان اللہ کے فیضان میں خلقت وجود میں آئی۔ شدّتِ شوق، شدّتِ تصور نے وجودی صورت لی۔ خلقت کی بنیادِ اولیں یہی حب، یہ ک اور ن کے مابین تڑپ پڑی۔ ضمیرِ کائنات سے انبساط کی حالت میں تسبیح ''لَهٗ مَافِی السَّمٰوات وَمَا فِی الارض'' جب فیضانِ

پاک سے اسی مشتِ خاک پر نورِ محمدیؐ کی تجلی ہوئی، مقامِ امر سے ذکرِ خفی عطا ہوا۔ باطن میں ایک ارتعاش ہوا۔ عالمِ خفائے آدم میں کُن ہوا۔ ذکرِ اسم ذات میں کلی کی سی تڑپ آئی۔ فکر کے جلوۂ صفات میں پھول کی طرح کھل گئے۔ اسم ذات ذکر ہوا، جلوۂ صفات فکر۔ ذکر میں ذات کی عصمت سموئی۔ فکر میں مآلِ عشق حاصل ہوا۔ گویا ازل اور ابد ضم ہو گئے۔ ہر لحہ ایک لبِ لامحدود ہوا۔ وقت ساکت ہوا۔ اس مستیٔ انبساط میں ہوش بھی وہی ہے، جو حُسنِ ازلی کو اپنے آپ کا ہوتا ہے۔ آگہی ذات کی، آگہی صفات کی، وجود سے گم، حق میں ضم۔

''هَلْ جَزَاءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَان'' ذات انائے مطلق تھی۔ صفات اپنی انا کا ظہور ہوا۔ انائے صفاتی ''اَصْلُها ثابتٌ'' اور انائے مطلق ''فَرْعُهَا فِی السَّمَاء'' ایک قلندر کی شان پڑی۔ اس کیف میں دمِ شمشیر، ذوالفقارِ علی وہ رعنائی ہے جو ستر ہزار حجابات کو چاک کر کے نورانی رف رف پر قربِ ذات تک لے جاتی ہے۔ اور ''لَوْلَاکَ لَمَا'' کے آئینہ میں اپنے آپ کی ہی جلوہ آرائی بنتی ہے۔

وا کر دیئے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حُسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

یہ انا کا ظہور ہے۔ ک اور ن کے مابین یہی انائے مطلق تھی۔ اسی کی رویتِ پاک، حُسن، خوبیِ حق کی صورت میں عالمِ خلق پر احسان ہوا۔

''سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهٖ. هُوَ اللهُ الْخَالِقُ
الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَا آلْحُسْنٰی''

مصوری کا کمال دکھلایا۔ شاہکارِ تخلیق، انسان ہی پڑا۔ اس کی تخلیق

وہی رازِ کُن تھی۔ اس لئے نکتہ ن وہی انا ئے مطلق ہے جس کا ظل تم ہو۔ جس کا ظل تمہارا نفسِ اتّم ہے۔ یہ نفس پاک ہے۔ مادی نفس تو فریب ہے۔ اس کو جسم کے سات فنا ہے۔ جس کو بقا ہے وہ تمہاری روح ہے۔ نفسِ پاک ہے۔ انا ہے۔ کیونکہ تمہاری انا ئے اتّم اس انا ئے مطلق کا ظل ہی تو ہے۔ جب اپنی انا کا عرفان ہوتے ہوتے انا ئے مطلق تک رسائی ہوئی تو اپنے عرفان میں رب کا عرفان ہوا۔ اس عرفان کے انبساط میں ذات کی آگہی میں مست ہوئے۔ اپنی منزل آپ بنے۔ دیدار ہوا۔ رویت نصیب ہوئی۔ حُسن میں بھی حق، خوبی، اچھائی، صداقت، سچائی میں بھی حق۔ حق، حق، حق۔

ک اور ن کے مابین اللہ کی ذات ہے۔ کہ ذات محض ہے اسے زلفِ معنبر، گیسوئے مشکیں، واللّیلِ یلتّ کہہ لو۔ ن نافۂ ذات ہے۔ نکتہ ن انا ہے۔ ن بوئے محبوبؐ "وَالضُّحٰی طٰسِیٰن" کہہ لو۔ اور ک اور ن کے مابین خزائن عطا کی جانے والی ہستی، انسانِ کامل ہے، محبوبؐ رب العالمین ہے۔ حامل و حاصلِ نورِ ذات ہے۔ وجودی فہم کے لئے اسے مظہرِ کُن کہہ لو۔ اس طرح وجود اور ذات کے درمیان خزائن، نورِ محمدیؐ ہے۔ حجاب اور اظہار کے درمیان خزائن نورِ محمدیؐ ہے۔ اسی نورِ محمدیؐ کی تابانی سے آئینہ وجود کی جلا ہے۔ ذرّہ ذرّہ میں یہ نورِ محمدیؐ پنہاں ہے مجلّی آئینوں میں اس کی حُسن و خوبی عیاں ہے۔ جہاں بھی اس نور کی تابانی اس کا کیفِ کُن حاصل ہو، تو فرطِ انبساط میں سبحان اللہ کہہ اٹھیں۔ کوئی درد بھری آواز، جیسے کوئل کی کوک سنیں تو سبحان اللہ۔ کوئی شیریں آواز سنیں جیسے صوتِ سرمدی تو کہیں سبحان اللہ۔

ہر سخنے کہ می گُنی قندِ حلاوت آیدت

مگر خود بات کرنا چاہیں تو زبان گنگ، ایک عالمِ تحیّر اور ایک

حسرت ۔ اور اگر حُسن کی کوئی جھلک دیکھ پائی تو ٹکٹکی بندھی، آنکھوں کو ٹھنڈک نصیب ہوئی۔ ہر لمحہ لبد ہوا۔

مرا از تُست ہر دم تازہ عشقے
ترا ہر ساعتے حُسنِ دگر باد

سبحانیت کا لُطف

ان لمحاتِ عدم میں زندگی اور حیات کے سرچشمے ہیں۔ موت تک کی آغوش میں وہ حُسن نظر آیا کہ موت کے دروازے پر غوطہ لگایا۔ روح اس پنجرہ سے نکلی پھر اس غوطہ سے باہر آئے، خدمتِ خلق کے لئے واپس بھیجے گئے تو سبحان اللہ۔ یا زندگی اور موت کی درمیانی برزخ میں ''حیٌّ و قیُّومُ'' کے قیام میں بیٹھے ہوں اور اس حالتِ جذب میں کوئی مخل ہوا۔ اور اس پر چشمِ برہم ڈال دی تو ایک نظام برہم ہوا۔ آخر یہ چشمِ برہم بھی تو اسی نگارشِ حُسن کی بات ہے جسے ذات کہ لیں۔ یہ ارتعاش اس سکونِ دائمی کی برزخ سے ظہور میں آتا ہے، جو کوئی ذات کو سمونے والا عاشق ایک بے ساختگی کے بانکپن میں، عالمِ انسانیت پر ڈالتا ہے۔ اور کسی کا مقدر بن جاتا ہے۔ یا پھر شانِ بے نیازی میں منہ سے کچھ کہ دیتا ہے، تو یہی اس کے الفاظ بقولِ غوث پاکؒ، ''کُن'' کا اثر رکھتے ہیں۔ اور وہ خوش نصیب ہے جس کے لئے یہ لفظ ''کُن'' ایک تقدیر بن جائے۔

ایک طرف یہ ادائے قلندرانہ، رُعبِ حُسن، دوسری طرف یہ تحیّر، یہ لب بندی، سبحان اللہ۔ ایک طرف یہ بے نیازی درویشانہ، یہ جلالِ فقر، دوسری طرف یہ عجز، یہ مقدر کی کشادگی، سبحان اللہ۔ یہ لفظ ''سبحان اللہ'' تجرید کی

''بِسْمِ اللہ'' ہے۔ ہاتھ میں ہاتھ آجانے کی بات ہے۔ یار کی رضا، اپنے میں سے جاری ہو جانے کی بات ہے۔ اپنے ہاتھ، اپنے وجود میں سجانیت آگئی ہو، تو حق کی رضا کے ساتھ عمل پیرا ہونے کا لطف لیں۔ اس مستی و سرشاری میں اس جوشِ جذب میں کوئی صداقت سے عمل ہو رہا ہو تو اس فرطِ انبساط میں سجانیت کا لطف لیں۔ شہیدِ جلی ہو کر، یار پر فدا ہو کر یا شہیدِ خفی، جیتے جی مر کر، اپنے جسم میں سجانیت کا نظارہ کرو یا پھر صابر بن کر مقدر پر شاکر ہو کر دیکھو۔ عشق کے سوزِ دوام میں قائم الصلوۃ، صائم الدھر ہو کر، ''وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ'' کا مزہ چکھو، تو سجانیت کے رمز کھلنے لگیں گے۔ یہ سمجھنے کی باتیں نہیں ہیں۔ ہو جانے کی حق الیقینی ہے۔ صبر و شکر میں ایک انبساط ہے۔ صلوٰۃ توحید کی مستی میں آجانے کا نام ہے۔ شہادتِ دیدار کی بات ہے۔ صوم قائم ہو جانے کی بات ہے۔ قیام میں ایک محرک و تابندہ انبساط ہے۔ قائم ہو جانا سوائے عشق کی مستی کے ممکن نہیں۔ ''قَيُّوْمٌ'' میں ایک بے پناہ محرک، سجانیت کی ادا ہے۔ ''حیٌّ'' میں ایک دائمی تابندہ حیات کا انبساط ہے۔

''حیّ قیّوم'' کا رمز پا جانا، خود اپنی دائمی حیات کے محرک قیام میں انبساط ہے۔ ک لورن کے درمیان بھی یہی حالت ہے۔ ک لورن ''حیّ و قیّوم'' دونوں کناروں کا ملاپ ہے۔ دونوں کناروں سے زندگی ابل رہی ہوتی ہے۔ یا جیسے مجمع البحرین، دو سمندروں کا ملاپ۔ مگر اپنی انا برقرار۔ ایک قربِ ذات، ایک شوق کی وحدت۔ وصال مابین طالب و مطلوب، دو دھڑکتے دلوں کا گلے ملنا۔ ایک محرک شدت کی تابندگی میں زندگی کا اجراء۔ ''فَاذْكُرُوْنِيْ اَذْكُرْكُمْ''۔ ذکر کی ہم آہنگی میں، دمادم ہمہ دم کا کیفِ دائمی۔ درمیان میں خزائنِ انا کا سرور۔ انانیتِ خودی کا انبساط۔ خود آگہی کی مستی۔ خود شناسی کا

اضطراب۔ اس کیفیتِ شدت میں بارہ لگام۔ اذن کی دیر۔

ک اور ن کا درمیانی وقفہ

ک اور ن کا درمیانی وقفہ ''کُن'' کی سات منازل، ک اور ن کے مابین سات دن۔ سات دن میں کائنات بنی۔ چالیس دن آدم کی مٹی گوندھی گئی۔ یہ اُدھر کے دن ہیں۔ اُدھر کا وقفہ اِدھر کی کافی مدت۔ یا معراج میں اس کے الٹ اِدھر کا وقفہ اُدھر کی کافی مدت۔ غرض کہ اس عالم کے شب و روز سے ان کی خفی نسبت ہے۔ یہ وقفہ رحمت ہے۔ ارتقاء کی دھیمی چال اس کی برکت ہے۔ جمادی زندگی ہو یا نباتی، حیوانی ہو یا انسانی، اس ارتقاء کے سلسلہ جاریہ اس ''کُن'' کی آئینہ دار بنی ہے۔ ساری کی ساری کائنات اس فروغِ کُن میں برابر پھیل یا سکڑ رہی ہے۔ موت و حیات کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ ایک زندگی دوسری کو جنم دے رہی ہے۔ وقفہ وقفہ منازل در منازل یہ ک اور ن کے درمیان خزائن رنگارنگ انوار میں جلوہ فگن ہو رہے ہیں۔ بیج کا زیرِ زمین رہ کر کلا پھوٹنا۔ آہستہ آہستہ پودے کا بڑھتے بڑھتے تناور بار آور درخت بننا۔ ماں کے پیٹ میں بچہ کے جسم کی ارتقائی منازل، پھر بعد میں پیدائش وہ بچپن، لڑکپن، جوانی کی منازل۔ اس وقفہ کی رحمتوں کی بے شمار مثالیں پیش کر رہے ہیں۔ اس وقفہ کی بنا پر ہی نباتات، حیوانات، انسان کو زندگی کے لئے شکرگزار ہونے کا موقع ملتا ہے۔ وجود کے احسان کا لطف، شکرانۂ بندگی کا کیف ملتا ہے۔ فیضان و ربوبیتِ شیخ میں روح کی ارتقائی منازل طے کرنا نصیب ہوتا ہے۔ خضرِ راہ کی نسبت کے طفیل علمِ لدنی کی راہ کھلتی ہے۔ اپنے باطن کے خزائن مابین ک و ن تک رسائی ہوتی ہے۔ اپنے اندر سچائی، خوبی اور باطنی حُسن

کا عرفان ہونے کے بعد حق شناسی کا موقع ملتا ہے۔ اپنی صلاحیتوں، امانتوں، انعامات کو بروئے کار لانے کی صلاحیت عطا ہوتی ہے۔ اپنے زمینِ وجود کے سات آسمان، نفس، قلب، روح، سر، خفی، اخفا، غیب تک عروج کی راہ کھلتی ہے۔ یہ فیضانِ شیخ بہ امرِ ربی ہے کہ ک اور ن کے درمیان خزائن، نورِ محمدیؐ سے رابطہ قائم کراتا ہے۔ ان خزائن کے وارث اقطاب ہوتے ہیں اور ان کے امام علیؑ ہیں۔ علیؑ باب مدینۃُ العلم۔ علم لدنی کے حامل بسم اللہ کہہ کر درِ خیبر اکھاڑنے والے۔

اسی بسم اللہ کا رمزِ کُن نصیب ہو، تو یہی اسمِ اعظم ہے۔ یہ عارف کا مقام ہے۔ عارف علم الٰہی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ حق کی عکاسی کرتا ہے۔ انوارِ محمدیؐ لے کر نشرِ حق کا ذریعہ بنتا ہے۔ ان خزائن، ان انوارِ محمدیؐ کے طفیل وہ خالق اور مخلوق کے درمیان رابطہ بنا ہوتا ہے۔ اور ادھر اللہ سے واصل ادھر مخلوق میں شامل۔ اسی کے وسیلہ سے کاروبارِ جہان میں ایک توازن قائم رہتا۔ ادھر اس کا رابطہ عالمِ امر سے ہوتا ہے تو ادھر اس کا تعلق خلقت سے۔ ادھر ابو الوقت ادھر اَنَا اُمَّتِی۔ اسی لئے اس کے وسیلہ سے جو چیز پہلے عالمِ مثال، عالمِ کُن، عالمِ اَمر میں طے ہوئی ہے اس کا اظہار اس دنیا میں یہاں کے وجودی وقت کے لحاظ سے کچھ مدت بعد ظہور میں آتا ہے۔ فقیر کا کہا ہوا کلمہ کُن کا اثر رکھتا ہے۔

گفتہ او گفتہ اللہ بود

عَبدُہٗ و رَسُوْلُہٗ

کیونکہ وہ فیضانِ حق سے سیراب ہوتا ہے، وہ ایک تو حیدی سکون، حق

آ گہی کے کیف میں زندگی گذارتا ہے۔ اپنے وجود اور حق سے اس توحیدی رابطہ کے عرفان میں اسے دائمی انبساط نصیب ہوتا ہے۔ اس انبساط میں خوبی، سچائی اور حُسن کا وہ خود مظہر ہوتا ہے۔ کُن کے خزائن کی سبحانیت خود اس کے پیکرِ وجود سے چشموں کی طرح ابل رہی ہوتی ہے۔ اس عالمِ یکتائی میں وہ کلی توحید وجود کے ساتھ ''سُبْحَانَ مَا اَعظَمَ شَانِیْ'' کہہ اٹھتا ہے۔ اس لفظ ''سبحان'' نے ساری دوئی مٹادی ہوتی ہے۔ ''سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْم'' ''سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی'' کا وہ خود پیکر ہوتے ہوئے عبودیت کا دامن نہیں چھوڑتا۔ عبودیت بڑی چیز ہے۔ ''مقامِ محمود'' ''عبدہٗ و رَسُولُہ'' کا مقام ہے۔ اسی لئے اس کے رکوع کے معنی مطیع ہو جانا ہے۔ رکوع اپنے کو مطیع کر دینے کی نشانی ہے۔ برتر ہستی کے لئے اپنے کو وقف کر دینا ہے۔ اس کا کیف وہی جانے جو ''وَارْکَعُوْا مَعَ الرّٰاکِعِیْن'' کا مصداق ہو۔ کائنات میں بھی یہی کچھ ہو رہا ہے۔ ادنیٰ اعلیٰ کے لئے وقف ہو رہا ہے۔ یہ رکوع کی نشانی دائرے کا نصف حصہ ہے۔ یہ ربوبیت کی شان ہے۔ کہ ایک حصہ ادھر سے ایک اُدھر سے۔ ایک ہاتھ اپنا، ایک اس کا۔ ساتھ اس کا عمل اپنا۔ خزائن اس کے عطا کردہ اور بارِ امانت ہمیں اٹھانا۔ ان رحمتوں کے انداز میں ربوبیت کارفرما ہے۔ جمادات، نباتات، حیوانات بھی ربوبیت کے مظاہر۔ اسی سجدہ، قیام و رکوع کی حالت میں زندگیاں گذارنے والے۔ ودیعت شدہ صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر زندگیاں گذارنے والے اشجار قیام میں، حیوانات رکوع میں ، جمادات سجدہ میں، ''وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ یَسْجُدَان'' اور انسان ذاتِ کُل کی سبحانیت کا مظہر۔ قیام میں بھی، رکوع میں بھی۔ سجدہ میں بھی انسان کا قیام اپنی خودی کا اقرار ہے۔ رکوع اپنی خودی کی اطاعت کی نشانی ہے۔ اور سجدہ اس خودی کو حوالے کر

دینے، سپردگی کی نشانی ہے۔ اس طرح ذاتِ کُل کے ساتھ کُلّی توحید میں آ کر ''مَیں'' اور ''تُو'' ایک ہو جانے کی سطح پر آ کر۔ پھر میں کو قربان کر دینا، عجزِ کُل میں سربسجود ہو جانا بڑی چیز ہے۔ نماز میں یہ دو سجدے نشانی ہیں۔ پہلا سجدہ خودی یا قیام کی نفی اور دوسرا سجدہ اقرارِ بندگی۔ گویا نفی، اثبات کے دو پہلو۔ سجدۂ بندگی شکرانہ ہے۔ بے ساختگی اور قرب کی نشانی ہے۔ عشق کی مستی ہے۔ روئے یار کا دیدار ہے۔ ''قَابَ قَوسَین او اَدنٰی'' دوقوسوں کا ملاپ ہے۔ پھر اس سجدہ شکر میں'' سبحان اللہ ربی الاعلی''۔ جب سجانیت میں اس طرح گھر گئے، ایک سرور کی لذتِ تحیر میں ہوگئے، تو ایک اندازِ توحید میں حمد وتحیت، دُرود وسلام اپنے مرکزِ وجود سے جاری ہوا۔

''اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰہِ وَالصَّلٰوۃُ اَلسَّلَامُ عَلَیکَ اَیُّھَا النَّبِیُّ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ''

انبساطِ دیدار

یہ نماز آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ معراج المومنین ہے۔ انبساط کی لذت ہے۔ مومن کے لئے دیدارِ رب کا انبساط ہے۔ اور جن کے نصیب میں ''کُن'' کے خزائن ہیں، ان کی دنیا لطافتوں کے دیدار کی دنیا ہے۔ یہ لطافتیں، یہ مجردات قلندر کے نصیب میں ہوتی ہیں۔ سب سے پہلے حُسن کی تجرید حسین کے وجود سے ماوراء حُسن دیکھنے والی آنکھ، عکسِ رخسار کی جھلک۔ ذرہ ذرہ، پتہ میں حُسن۔ سب کائنات حق کے حسین تخیل کی آئینہ دار۔ خواہ پیکرِ حُسن ہو یا مظاہرِ قدرت بچہ کی معصومیت ہو یا ماں کی محبت، روئے لیلیٰ پر تجلی حق ہو یا قلبِ مجنوں پر برقِ حُسن، آہِ سحر گاہی ہو، یا دل کی جولانی، بےخودی کی کیفیت ہو یا دل کی ویرانگی، آواز کی شیرینی ہو، یا اداؤں کا خنجر۔ سب لطافتیں ایک ہی

حُسن ازلی کی نشاندہی کرتی ہیں۔ ہر رخسارِ دوست میں اپنے آپ کا دیدار ہے۔ اسی تجریدِ حُسن کے ذریعہ قلندر کی روح کو ایک انبساط کی کیفیت ملتی ہے۔ وہ منازل در منازل حُسن کی تجرید سے خوبی کی تجرید، پھر شہادت کی تجرید کی طرف قدم رکھتا ہے۔ اس طرح قلندر نے خزائن ''کُن'' کے انوار کو پالیا ہوتا ہے یہی تجریدِ اُولیٰ ہے۔ یا تعین اوّل یہی مابین نور ھُوئی کا مقام ہے۔ اس نورِ محمدیؐ کی جھلک جب اپنے اندر پالیں، ''مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ'' کے مصداق ہوں تو معلوم ہوگا کہ یہی وہ چراغِ امانت ہے جو اپنے اندر روشن ہے۔ اور جب اس ''رَاَءَ یُتُ رَبِّی بِرَبِّی'' حق نے حق کو دیکھا۔ اس تجلی میں، زمان و مکان میں ک اور ن کے مابین خزائن کے تنویر کی تصویر نظر آئی۔ اپنے اندر بھی وہی خزائنِ کُن اور باہر بھی ان ہی خزائن کے انوار ایک ہی اکائی میں دیدار، ایک ہی اکائی میں انوار۔ ایک ''کیفِ ھَا ھُوتی'' ایک کیفِ انبساطِ ازلی۔

پس عدم گردم عدم چوں ارغنوں
گویدم انّا اِلَیه راجِعُون

❁❁❁❁